گلی ترقی کے افسانوں میں یادنگاری کا عنصر

بصیرہ عنبرین

ABSTRACT:

Goli Taraghi is a representative modern fictionist of Iran. She has introduced new trends in Iranian fiction. Her fiction works abound with the element of reminiscence. This aspect does not only depict changes in her personal life but also represents changes caused by Irani Revolution. She often suffers from nostalgia in her fiction but her positive thinking saves her from disappointment and her short stories turn to loving the past positively. It is worth mentioning here that aspect of reminiscence is woven in her fiction while carrying all technicalities of fiction. This article covers the aforementioned aspect and it is the first piece of research in Urdu.

Keywords: Goli Taraghi, Sanaviyat, Flashback, Reminscene

گلی ترقی کا شمار ایران کی نمائندہ اور رجحان ساز خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا اصل نام زہرا ترقی مقدم ہے اور وہ ۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو تہران میں پیدا ہوئیں۔گلی ترقی کا تعلق ایران کے ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ان کی والدہ ایران کے معزز خاندان سے تھیں اور والد لطف اللہ ترقی نہ صرف پارلیمنٹ کے ممبر تھے بلکہ اس عہد کے جانے پہچانے پبلشر، صحافی اور معروف ایرانی رسالے ''ترقی'' کے مدیر تھے۔ ان کی زندگی تحریر وتسوید کے ساتھ ساتھ ادارتی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے گزری۔ لطف اللہ ترقی کی شدت سے خواہش تھی کہ ان کی بیٹی ایک مصنفہ بنے۔گلی ترقی کی تحریروں سے ان کے والد کی اس آرزو کا جابجا اظہار ملتا ہے اور وہ اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ بچپن ہی سے ایک مصنفہ بننے اور امریکا جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب میری آنکھوں میں بس گیا تھا۔گلی ترقی کے سوانحی حالات سے پتا چلتا ہے کہ محض چار پانچ برس کی عمر میں ان کا تخیل ننھی ننھی کہانیاں بننے لگا اور ان کے شب وروز قصہ کہانیوں کی دنیا میں بسر ہونے لگے۔ ناہید مظفری سے گفتگو کرتے ہوئے ایک مصاحبے میں گلی

ترقی نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی جانب یوں توجہ دلائی ہے:

''میرا خیال ہے کہ میں نے پیدا ہوتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یوں سمجھیے کہ میری ولادت کے وقت دنیا میں جو میری پہلی آواز بلند ہوئی ہوگی، وہ میری مستقبل میں لکھی جانے والی کہانی کا پہلا جملہ تھی۔ میرے والد ایک ادیب تھے اور دو ہفتہ وار جریدے نکالا کرتے تھے۔ مجھے ان کے مطالعے کے کمرے میں جانا اور دیر تک لکھتے ہوئے ان کا مشاہدہ کرتے رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میں دیکھتی کہ وہ اپنا قلم روشنائی میں بگھوتے اور پھر صفحے پر لفظوں سے عجیب وغریب سے کیڑے مکوڑے بنتے چلے جاتے، پھر وہ مجھ سے کہتے: ''دیکھو یہ کیا جادو ہے؟ ان سب کو اگر ملائیں گے تو ایک چاکلیٹ بن جائے گی یا ایک بڑا سا کیک تیار ہوجائے گا، یا پھر بن جائے گا تمھارا نام___''
میں ابّا جان کی ان عجیب وغریب باتوں سے مسحور ہو کر رہ جاتی۔ یہ سب تو ایک جادو کی طرح تھا۔ ہر سحر انگیز چیز جیسے اُس روشنائی کی دوات ہی میں پوشیدہ تھی___اور وہ سب کہانیاں بھی اس میں پنہاں تھیں جو میں مستقبل میں لکھنا چاہتی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ اُس دن جب ابا جان باہر چلے گئے، تو میں پھر سے کمرے کی طرف دوڑی اور ان کی کرسی پر براجمان ہوگئی___اُس وقت میری عمر محض چار برس تھی۔ میں نے اپنی انگلیوں میں قلم تھاما اور صفحے پر ویسے ہی کیڑے مکوڑے بنانے لگی اور جلد ہی ان سے ایک کہانی ترتیب دے دی۔ بعد میں، میں نے روشنائی بھرے ہاتھوں کو چاٹ کر صاف کیا۔ میرا پورا چہرہ بگڑ گیا تھا اور سفید لباس پر جا بجا داغ پڑ چکے تھے___یہ سب کچھ کر کے میں گویا جنت میں پہنچ گئی تھی، جی ہاں میں اب ایک ادیبہ تھی___اسی اثنا میں امی جان کی چیختی چنگھاڑتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی: ''اُف میرے خدا گندی بچی، جلدی سے کپڑے بدلو اور اپنا ہاتھ منھ دھولو۔'' کوئی یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ تو میں نے اپنی پہلی کہانی تحریر کی تھی، اور شاید یہ میری زندگی کی سب سے اچھی کہانی تھی___افسوس کہ وہ کہانی دُھل کر مٹ گئی بلکہ مجھ کہنا چاہیے کہ یہ میرے لیے سنسرشپ کا پہلا ہول ناک تجربہ تھا___''[۱]

گلی ترقی نے ابتدائی تعلیم شمیران (ایران) میں حاصل کی۔ بعدازاں وہ نوعمری میں امریکا چلی گئیں اور ڈریک یونیورسٹی سے فلسفے میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور واپس وطن آ گئیں۔۱۹۶۰ء میں وہ انٹرنیشنل ریلشننگ کے شعبے کی ایک آرگنائزیشن سے وابستہ ہوگئیں۔ ۱۹۶۷ء میں تہران یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد وہ تہران یونیورسٹی میں فلسفہ، نفسیات اور اساطیر و علائم کے موضوعات کی تدریس سے وابستہ ہوگئیں۔ انقلاب ایران (۱۹۷۹ء) کے بعد جب عارضی طور پر تمام یونیورسٹیاں بند کردی گئیں تو وہ جلا وطن ہو کر پیرس چلی گئیں۔ جلا وطنی سے قبل ہی ان کی اپنے سے شوہر سے جو سینما سے وابستہ تھے طلاق ہوگئی تھی۔۱۹۹۲ء کے بعد سے ہجرت کا زمانہ انھوں نے پیرس میں اپنے دو بچوں کے ہمراہ بسر کیا۔ پیرس میں وہ زیادہ تر درس و تدریس سے وابستہ رہیں اور یہیں قیام کے دوران میں ان کی افسانوی تخلیقات بھی سامنے آتی رہیں۔ حالات معمول پر آنے کے بعد گلی ترقی تسلسل کے ساتھ ایران آتی رہیں۔

گلی ترقی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز مختصر کہانیوں اور مضامین سے کیا جو ایران کے مختلف روزناموں اور رسائل

و جراید میں چھپتے رہے۔ان کے افسانوں میں ڈرامائیت کے عناصر کے باعث ان کے بعض افسانوں کو فلمی صورت بھی دی گئی۔تخلیقی وُفور کے پیشِ نظر گلی ترقی نے افسانہ نویسی میں بہت تیزی سے مقام بنایا۔اس زمانے میں ان کی معروف ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد سے گہری دوستی رہی اور وہ ان کی مداح بھی تھیں۔اسی طرح وہ سہراب سپہری سے بھی متاثر تھیں۔ ایران میں قیام کے دوران گلی ترقی کی ادبی سرگرمیاں شد و مد سے جاری رہیں۔ بعدازاں ہجرت کے بعد پیرس میں رہائش پذیر ہونے پر بھی انھوں نے اپنے ادبی سفر کو جاری رکھا۔انھوں نے ایرانی افسانے میں بہت سے تجربات کیے اور فارسی ادب کو افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول اور ناولٹ جیسی اصناف نثر سے گراں مایہ کیا۔گلی ترقی کا افسانوی ادب سے متعلق یہ تخلیقی سفر بہ دستور جاری ہے۔

گلی ترقی کے افسانوی مجموعے''من هم چه گوارا هستم''(۱۹۹۱ء)''دو دنیا''(۲۰۰۲ء)''انار بانو و پسر ھا یش''، ''خاطرہ ھای پراگندہ (۱۹۹۴ء)، ''جای دیگر''(۲۰۰۰ء) اور''ھشت داستان'' کے نام سے شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں''خوابِ زمستانی''اور''خانہ ای در آسمان'' کے عنوان سے عمدہ ناولٹ بھی سامنے آئے۔اسی طرح ''دریا پری کا کل زری'' ان کی منظوم افسانوی کہانی ہے جو ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آئی۔گلی ترقی کے افسانے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی ہوئے۔اس سلسلے میں''انار بانو و پسر ھا یش'' کا ترجمہ "The Pomegranate lady and her Sons: Selected stories کے نام سے ۲۰۱۳ء میں ساوا خلیلی نے کیا جسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔نیز ان کے ناولٹ''خانہ ای در آسمان'' کو فریدون فرخ نے ۲۰۰۳ء میں ترجمے کی صورت میں ڈھال کر اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔گلی ترقی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی کتب اور افسانوں کی اشاعتیں بارہا سامنے آئیں اور ان کی ادبی و تجزیاتی صلاحیتوں کے پیش نظر ایرانی فکشن پر ان کی رائے کو صائب سمجھا جاتا ہے۔ ادبی حوالے سے ان کے متعدد انٹرویو کیے گئے بالخصوص سنسر شپ کے کڑے ضابطوں کے باعث گلی ترقی نے جس طرح ایرانی افسانہ نویسی میں مقام بنایا، اس پر ان سے متعدد گفتگوئیں کی گئیں اور انھیں سراہا گیا۔ایران میں ان کے مداحوں کی تعداد کثرت سے ہے اور انھیں ستائشی نظروں سے دیکھا جاتا ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ گلی ترقی کی تخلیقی صلاحتیں انھیں ہر قسم کی پابندیوں اور جکڑ بندیوں کے باوصف افسانوی منظر نامے پر نمایاں کرتی چلی گئیں۔ایک انٹرویو میں اس دور کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

''جب اسلامی انقلاب آیا تو ایسے تمام آرٹسٹ اور پڑھے لکھے لوگ، ادبا و شعرا، پینٹرز وغیرہ جو انقلاب کے حقیقی مقاصد سے بے خبر تھے اور بہت پر جوش تھے ۔ میں اس وقت تہران میں تھی اور اکثر دیکھتی تھی کہ بہت سی لڑکیاں چادریں اوڑھ کر اپنے آلاتِ موسیقی سنبھالے میوزک کلاس کا رخ کر رہی ہوتیں_اور پھر جلد ہی یہ جوش اور ولولہ ایک گہری یاسیت میں تبدیل ہو گیا۔اتنا سب کچھ بدل چکا تھا کہ اب واپس پرانی حالت میں آنا مشکل تھا۔ انقلاب کے دوران میں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں جو خاص طور پر نچلے طبقے سے وابستہ تھیں ایسی تھیں جنھوں نے انقلاب کی خاطر گلیوں میں گردش کرتے ہوئے ہجوم کا حصہ بننا بہت پسند تھا۔ غالباً وہ خود کو ان حالات میں بہت اہم سمجھ رہی تھیں اور بہت جوشیلی تھیں۔ یوں جیسے اب انھیں نئی پہچان مل رہی تھی۔ وہ اپنی پرانی حالت میں لوٹنا نہ

چاہتی تھیں اور یہ فرض کیے ہوئے تھیں کہ انھیں اب عدم شناخت گوارا نہ ہوگی۔ایک معروف مصنفہ نے مجھے بتایا کہ اسے خواتین کی جیل میں بہ طور گارڈ مقرر کر دیا گیا تھا۔ انقلاب سے قبل اس نے کبھی لکھنے لکھانے کی جرأت تک نہ کی تھی لیکن انقلاب کے بعد خود اس کے شوہر نے اسے لکھنے پر اکسایا۔ اور کم وبیش یہی کچھ بہت سے لوگوں کے ساتھ ہورہا تھا۔ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یونیورسٹیوں میں ۶۵% طالبات تھیں اور ان کی اکثریت معاشی اعتبار سے نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔''[۲]

گلی ترقی کے مطابق ایرانی افسانے کی صورت گری میں خواتین قلم کاروں کا اہم کردار رہا ہے اور یہ خواتین ہی ہیں جنھوں نے حقیقی طور پر اپنے عہد کے فکشن کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا:

''میں ایرانی تخلیق کار خواتین کے کاموں کو سنجیدگی سے دیکھتی ہوں۔ان کی تحریروں میں عاجزی اور خلوص ہے جو عموماً آپ کو مرد لکھنے والوں میں دکھائی نہیں دیتا۔ انقلاب سے قبل ایرانی ادیب زیادہ تر کمیونسٹ نظریے کے تابع تھے۔آپ اس ادب کو سماجی وسیاسی ادب کہہ سکتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر ایرانی ادبا معاشی طور پر نچلے طبقے سے متعلق تھے۔ چنانچہ انھوں نے ادب میں مزدوروں اور کسانوں کے مسائل نمایاں کیا۔ مارکسی نظریہ اس قدر چھا چکا تھا کہ جو دو ایک لکھنے والے ان کے درمیان کھاتے پیتے گھرانوں سے بھی تھے، وہ بھی جلد ہی مارکسی ہوگئے اور یہی موضوع اپنا کر معاشرے کے دھتکارے ہوئے لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے لگے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایسے مرحلے پر خواتین نے ادب کو نیا رخ دیا۔ وہ یوں کہ انھوں نے فکشن میں اپنی ذات کا اظہار کیا اور اپنی تنہائیوں، اداسیوں اور ناآسودہ زندگیوں کو موضوع بنایا۔سرکاری سطح پر سنسرشپ، نجی سطح پر سنسرشپ اور خود ان کے اندر کی فطری شرم وحیا کے باعث وہ کھل کر اظہار کرنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ اس کے برعکس ان کی تحریروں میں نسائیت کو برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی فطری تانیثی تیزی وطراری کے باعث زیادہ تر اشاراتی اور رمزی انداز نمایاں ہوا۔یوں عورتوں نے محبت کو موضوع بنایا اور محبت ہی کے سپنے دکھائے لیکن یوں کہیے کہ قدرے اوٹ میں ــــ کچھ بھی نہ کہا اور کچھ کہہ بھی گئے کے مصداق ان ادیب خواتین نے ہر قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس قبیل کی خواتین میں سے ایک نے کہا کہ اگر میرے شوہر کو یہ معلوم ہوجائے کہ میرے دماغ میں کیا کچھ چل رہا ہے تو وہ مجھے جان سے مار ڈالے اور یہ بات بالکل سچ تھی کیونکہ وہ علامتی اسلوب اپنائے ہوئے تھی۔میرے خیال میں مرد اس طرح نہیں لکھ سکتے اور نہ ہی اس قسم کے ادب کو سنجیدگی سے لے سکتے ہیں۔''[۳]

قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود گلی ترقی نے دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے مقابلے میں محض نسائی جذبات کی علامتی ورمزی پیرایے میں عکاسی نہیں کی بلکہ وہ زیادہ تر عورت کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی شخصیت کے متنوع روپ دکھاتی ہیں۔ انھوں نے اکثر اوقات مرد اور عورت دونوں کے کرداروں میں نفسیاتی و فلسفیانہ گرہیں

وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوی کردار ان ہی کی طرح دو دنیاؤں کے مسافر ہیں۔ ایک داخل کی دنیا،دوسری باطن کی دنیا___اوران دو دنیاؤں میں معلّق یہ سبھی کردار اپنی ذات کے بحرانوں سے نکلنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اگر غور کریں تو یہ عہد جدید کے فرد کا المیہ بھی ہے۔خود گلی ترقی کی ذاتی زندگی دو دونیاؤں کی اسیر رہی۔ ایک دنیا وہ ہے جو ایران بسر کی گئی زندگی سے عبارت ہے اور یہ اب قصہ پارینہ ہوچکی ہے۔ جب وہ ماضی کے اوراق الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس دنیا کی کہانیاں سناتی ہیں تو ان کے ہاں ناسٹلجیائی رنگ ابھرتا ہے اور ان کے افسانوں میں یادنگاری کا عنصر پیدا ہوجاتا ہے۔ دوسری دنیا پیرس کی زندگی سے عبارت ہے جو ایک خول کی طرح ہے اور زیادہ تر ان کی شخصیت کے خارجی پہلوؤں سے عبارت ہے۔نفسیاتی سطح پر دیکھیں تو ان کی تحریروں میں موجود کرداروں میں بھی ''چہرے'' (Persona) اور ''نقاب'' (Shadow) کی ثنویت بھی دکھائی دیتی ہے اور ان کے افسانوں میں دونوں دنیاؤں سے وابستہ حقیقی و واقعی کرداروں کے ''چہرے'' اور ''نقاب'' اکثر اوقات آپس میں خط ملط ہوجاتے ہیں، آپس میں مکالمہ کرتے ہیں اور پھر اپنے اپنے مقام پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔گلی ترقی ناہید مظفری کو اس حوالے سے بتاتی ہیں:

> ''میری زندگی زیادہ تر دو دنیاؤں میں بسر ہوئی ہے۔ میں نے ۱۹۷۹ء میں انقلاب کے آغاز ہی میں ایران کو چھوڑ دیا اور اس وقت سے آج تک میری زندگی پیرس اور تہران کے درمیان سفر کرتے ہی گزری ہے___ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک کا سفر___فطری طور پر اس دہری حیثیت نے میری تخلیقی صلاحیتوں پر بھی اثر ڈالا ہے۔ میں ایران واپس جانا چاہتی ہوں کیونکہ مجھے کہانی کی تحریک وہیں سے ہوتی ہے اور میرے تمام جذبے اسی مٹی سے وابستہ ہیں۔ ایران میرے لیے تضادات کا ایک سمندر ہے۔ یہ المیہ وطربیہ دونوں طرح کے متضاد کرداروں کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے، اور یہ دنیا مضحکہ خیز شروعات سے بھرپور ہے اور ورائے حقیقت پسندی حالات و واقعات سے اٹی پڑی ہے۔ دوسری طرف پیرس کی دنیا ہے جہاں میری ملاقات کبھی انار بانو سے ہوتی ہے تو کبھی دلبر (خادمہ) سے اور پیرس میں رہنا میرے لیے ایک آسودگی سے بھرپور تجربہ ہے کیونکہ آزاد لوگوں کی تروتازہ فضا میں سانس لینا مجھے لکھنے کا ماحول فراہم کرتا ہے۔ پیرس کا توانا ثقافتی منظرنامہ، روم اور نیویارک کی دنیا،___اور فرانسیسی یا امریکی آرٹسٹوں یا وہاں کی عورتوں اور مردوں کے خیالات، میری ذہانت کو تقویت دیتے ہیں۔ دوسری طرف ایران مجھے ایک داخلی تحریک دیتا ہے، وہاں مجھے لکھنے کی تقویت اپنے باطن سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے___خواہ وہ کیسی ہی ہو___ پیرس میں مہاجر ہوکر رہنا مجھے ان دہری حیثیت کے بہت سے ایرانیوں کا احساس دلاتا ہے جو کبھی وطن لوٹ کر نہیں جاتے۔یوں ان کی طویل تر، گہری اور چھپی ہوئے سوچیں، اندیشے اور وسوسے میری کئی کہانیوں کا موضوع بنتے چلے جاتے ہیں۔ جلاوطنی بذات خود، ایک عجیب وغریب انسانی حالت و کیفیت ہے، یہ ایک ایسا

کرشمہ ہے اور اس پر مختلف زاویوں سے سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔''[۴]

گلی ترقی کے مطابق اسی دہری حیثیت نے ان کے اندر ایک سنسر شپ سا قائم کر دیا۔ وہ دل چسپ اور قدرے علامتی پیرایے میں ان دو دنیاؤں کے تناظر میں اپنے مؤقف کی یوں وضاحت کرتی ہیں:

> ''جونہی میں اپنے خیالات کو کاغذ پر اتارنے لگتی ہوں، میرے آنکھوں کے سامنے سنسر شپ کے شعبے سے متعلق اشخاص کے چہرے لہرانے لگتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ تلوار لے کر میرے لفظوں، جملوں اور پیراگرافوں کو میری کتاب سے کاٹ رہے ہیں۔ میں ساکت ہو جاتی ہوں اور ایسے میں سخت ہیجان محسوس کرتی ہوں ــــ میں خود کو ایک محدود سوچ کی مصنفہ کے طور پر درک کرتی ہوں جس کے متخیلہ کو ہراساں کیا جا رہا ہوں ــــ ان حالات میں خود پر جبر کرتے ہوئے میں کہانی کا ایک روپ اس آدمی کے لیے تیار کرتی ہو جو سنسر شپ کے شعبے سے وابستہ ہوگا اور دوسرا خود اپنے لیے ــــ اور کہانی کے اس دوسرے روپ میں ایک آزاد اور خود مختار مصنفہ بن جاتی ہوں، میں اپنی مرضی سے موضوعات کا چناؤ کرتی ہوں، سچ بولتی ہوں اور جیسے الفاظ چاہتی ہوں اپنے استعمال میں لاتی ہوں۔ میں اس دوسرے روپ میں اپنے خیالات کو دور تک پرواز کرنے دیتی ہوں اور اپنی داخلی خواہشات کو تحریر کی نمایاں سطح پر تیرنے دیتی ہوں۔''[۵]

دل چسپ امر یہ ہے کہ ثنویت کے اسی رجحان نے گلی ترقی کے افسانوں میں یاد نگاری (reminscene) کا عنصر پیدا کر دیا ہے۔ یاد نگاری افسانوی اسلوب کی وہ صورت ہے جس کے تحت لکھنے والا ماضی کے حالات وواقعات کے تناظر میں اپنی شخصیت کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ یہ گویا تحلیل نفسی ہی کی ایک شکل ہے جو تحریر میں مثبت ماضی پسندی کی صورت جھلکتی ہے۔ گلی ترقی نے اپنے بے ساختہ اور رواں دواں اسلوب میں یادوں کے دریچوں سے پردے ہٹائے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ اس عمل کے دوران میں افسانے کے تمام تر اجزا و عناصر برقرار رہتے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ کردار نگاری، مکالمہ نویسی، جزئیات نگاری اور تصویر آفرینی کیفن پر انھیں خاصا عبور حاصل ہے۔ مزید براں ان کے اسلوب میں تیزی، کاٹ اور رمزیت کے عناصر کے باعث یاد نگاری کا پہلو بوجھل پن پیدا نہیں کرتا بلکہ پڑھنے والا متحیر رہ جاتا ہے کہ مصنفہ کی یادیں عمدگی سے کسی افسانوی کرداروں میں ڈھل گئی ہیں اور یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ افسانوی کردار ہے یا مصنفہ کی ناسٹلجیاتی دنیا کا حقیقی و واقعی کردار ــــ خصوصیت کے ساتھ گلی ترقی افسانوی مجموعوں ''خاطرہ ھای پراگندہ''، ''جای دیگر'' اور ''دو دنیا'' میں یاد آفرینی کے عنصر نے عجیب و غریب افسانوی دنیائیں ترتیب دی ہیں۔ یہاں گلی ترقی کی توجہ اپنے بچپن، نوعمری اور جوانی کی یادوں کو افسانوی رنگ میں رقم کرنے کے ساتھ ساتھ غم مسافرت و مہاجرت کے بیان کی طرف بھی ہے۔ ان مجموعوں میں شامل افسانوں میں مصنفہ کی دو دنیاؤں میں بٹی ذہنی و نفسیاتی کیفیت بہ خوبی دیکھی جا سکتی ہے ــــ گلی ترقی کے اکثر و بیش تر افسانوں میں داخلی واردات کی یہ صورت دخیل ہے اور ایسے مقامات پر حالات و واقعات کی دنیا سے ان کا رابطہ

دل کش افسانوی فضاؤں میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

گلی ترقی کے متذکرہ تینوں افسانوی مجموعوں میں یاد نگاری کے عنصر کو متنوع جہتوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اوّلاً ان کے ہاں خاندانی و نجی سطح پر ان کی قریب ترین شخصیات سے وابستہ یادیں افسانوی پیرایے میں ڈھلی ہیں جن میں ان کا گھر، اسکول، اسکول کی بس، بس کا ڈرائیور، سہیلیاں، محلے دار، ننھیال اور ددھیال کے افراد، ان کے والدین، بچے، بہن بھائی، استاد استانیاں، ملازم، خانساماں وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ یہ حصہ شمیران کی یادوں کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے جہاں ان کی زندگی کا ابتدائی اور نہایت خوش گوار اور خوش حال زمانہ گزرا۔ یاد نگاری کے عنصر پر مبنی اس قسم کے افسانوں میں ''اتوبوس شمیران''، ''دوست کوچک''، ''خانم ھا''، ''گل ھای شیراز''، ''آن سوی دیوار''، ''خانہ ی مادر بزرگ'' اور ''پدر'' خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں۔

افسانہ ''اتوبوس شمیران'' میں اسکول کی بس کے ڈرائیور عزیز آقا سے وابستہ بچپن کی معصوم یادیں زندہ کی گئی ہیں تاہم یاد نگاری کا یہ عمل بچپن کی یادوں کی تروتازگی کے سنگ نفسیاتی باریک بینی لیے ہوئے ہے۔ یہ افسانہ فلیش بیک تکنیک میں مرقوم ہے۔ مصنفہ پیرس میں اپنی بیٹی کے ساتھ ۷۰ نمبر کی بس کے لیے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہے لیکن بس اسٹاپ پر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی بس چل پڑتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے برف باری بھی ہونے لگتی ہے۔ بس کا یوں چلے جانا اور برف باری کا ہونا، یہ دونوں خارجی واقعات افسانہ نویس کو اس کی داخلی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ اسے لگتا ہے یادوں کہ ایک شفاف غبار نے گرد و پیش کی فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور شہر کے معمول کے شور شرابے کی جگہ ہر سُو ایک خوش کن خاموشی چھا گئی ہے۔ ہر طرف سناٹا اور اداسی ہے۔ گرد و پیش کے لوگ ہیولوں کے مانند برف کی اس دھند میں گم ہوگئے ہیں اور اردگرد کی عمارتیں محض لکیروں کی طرح دکھائی دے رہی ہیں۔ ایسے میں یادوں کے جھروکے سے گلی ترقی کو نانی جان کی آواز سنائی دیتی ہے:

> ''فرشتہ ھا سرگرم خانہ تکانی ھستند۔ گرد و غبار ابرھا را می گیرند و فرشھای آسمان را جارو می زنند۔''[۶]

(فرشتے اپنے ٹھکانوں کی صفائی ستھرائی میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ بادلوں کا گرد و غبار صاف کر رہے ہیں اور آسمان کے قالینوں پر جھاڑو دے رہے ہیں)

افسانہ نگار اس آواز کے تعاقب میں ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگتی ہے تو یک لخت ماضی سے مربوط محبت بھرا منظر نامہ اس کی نگاہوں کے سامنے لہرانے لگتا ہے:

> ''بہ زمستانھای تہران فکر می کنم، بہ کوہ ھای سفید و بلند البرز در زیر آسمانی فیروزہ ای و
> بہ درختان عریان باغمان کہ بہ خواب رفتہ اند و غرق در رویای بازگشت پرندگان مھاجرند۔
> روز ھای کودکی، ریزش برف کہ شروع می شد تمامی نداشت۔ شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ، روز ھارا می
> شمردم، سہ شنبہ، چھارشنبہ، پنجشنبہ، برف می آمد؛ دہ سانتیمتر، بیست سانتیمتر، نیم متر، تا جایی کہ
> درھا یخ می زد و مدرسہ برای یک ھفتہ تعطیل می شد۔

چہ سعادتی چہ خوشبختی باورنکردنی! یک ھفتہ صبحھا ماندن در رختخواب، یک ہفتہ بازی توی کوچہ با هزار و یک پسردایی و دختر خالہ، یک ہفتہ بدون ترس از دیدن خانم ناظم و یا برخورد با معلم عبوس حساب ونخواندن از روی کتا بھای کسل کنندہ ونوشتن مشق، یک ہفتہ بدون حفظ کردن شعری طویل و بی معنا و یا تمرین خط باقلم نی و مرکب سیاہ؛ رھا از چنگ درس و مدرسہ، ھفت روز آزادی و بازی''۔ے

(میں تہران کے سردیوں کے موسم کو یاد کرنے لگتی ہوں ۔ ایسے میں مجھے نیلگوں آسمان کے نیچے البرز کے بلند و بالا اور برف پوش پہاڑ اور اپنے گھر کے باغ میں لگے ٹنڈ منڈ درخت یاد آنے لگتے ہیں جو موسم سرما کی آمد پر ویران ہوجاتے اور کوچ کرجانے والے پرندوں کے لوٹ آنے کا سپنا دیکھ رہے ہوتے۔ بچپن کے دنوں میں جب بھی برف باری ہوا کرتی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ہفتہ، اتوار، پیر___ ہم دن گننے لگتے اور پھر منگل، بدھ، جمعرات تک مسلسل برف پڑتی رہتی ؛ دس سینٹی میٹر، بیس سینٹی میٹر، حتیٰ کہ اس کی انچائی آدھ میٹر تک ہوجاتی اور پھر ایک ہفتے کے لیے اسکول بند ہوجاتے تھے۔ یہ ہمارے لیے بڑی خوش قسمتی اور ناقابل یقین خوش نصیبی کی بات ہوا کرتی تھی۔ پورا ایک ہفتہ صبح دیر تک اپنے بستروں میں پڑے رہنا؛ پورا ہفتہ گلی میں ماموؤں کے لڑکوں اور خالہ کی بیٹیوں کے ساتھ کھیلنا ؛ پورا ہفتہ پرنسپل صاحبہ کی شکل دیکھے بغیر بنا کسی خوف کے رہنا؛ یا ریاضی کی ترش مزاج اُستانی صاحبہ سے ملاقات نہ ہونا اور پورا ہفتہ اکتادینے والی کتابوں کو پڑھے بغیر گزارنا اور ان کی نامعقول مشقوں سے نجات پانا، پورے ہفتے کے لیے بےمعنی اور طول وطویل نظموں کو رٹے لگانے یا ان کیتمرینوں کو سیاہی میں قلم ڈبوکر تختی پر لکھتے رہنے سے رہائی پالینا؛ یوں اسکول اور کورس کے شکنجوں سے آزاد ہوکر پورے سات دن بھرپور آزادی اور کھیل تماشوں میں بتادینا۔)

یہ منظر یاد کرتے ہی گلی ترقی کو ماضی کے وہ کردار بھی یاد آنے لگے ہیں جو اس کے خاندان کے اہم اور قریبی افراد تھے اور پھر ان کے خارجی و باطنی نقوش افسانے میں یادوں کا سماں دل کش بناتے چلے جاتے ہیں ۔

''چہ کیفی داشت وقتی مہمان داشتیم و برف راہ ھا را می بست وھمۂ کسانی کہ منزل ما بودند دو سہ شب می ماندند۔مھما نھای ھمیشگی خانۂ ما اینھا بودند:

___مادر بزرگ لاغر ومھر بانم کہ روز وشب نماز می خواند واز خدا برای ما خوشبختی و پول وسلامتی و عمر دراز می خواست۔

___بی بی جان، خالۂ پیر مادر، کہ گوشھایش نمی شنید وحواسش کار نمی کرد۔ مرا بہ جای برادرم می گرفت، برادرم را بہ جای یکی از پسر دایی ھاو پسردایی را بہ جای ھمسایہ وھمسایہ رابہ جای من۔

___خالہ آذر، نازنینم با بچہ ھای کوچک و شیطانش کہ توی راھروھای خانہ جفتک چھارکش بازی می کردند واز در و دیوار و درختھا بالا می رفتند و زوزہ کشان، مثل میموںھای وحشی ، روی نردۂ پلہ ھا

سُر می خوردند و پایین می آمدند۔
___ دایی جان احمد خان کہ مہربان ترین دندان ساز دنیا بود و دلش نمی آمد دندان کسی را بکشد ۔ ہر بار کہ یکی از ما گریہ می کرد، اشک درچشمھایش حلقہ می زد۔
___ دایی بزرگہ، افسر توپخانۂ ارتش کہ از اسب می ترسید و از توپ وتفنگ وحشت داشت وھمانِ اولِ کارلباس افسریش را درآورد و بہ جای آن پیشبندی زنانہ بست و ماند خانہ۔ مرباھای خوشمزہ درست می کردو بلوزھای پشمیِ رنگارنگ می بافت۔
___ و بالآخرتو باخانمِ چاق وتن بلکہ قصہ ھای عجیب وغریب بلد بود و باجن واَرواح سروکار داشت ۔ جادوگری می دانست و برایِ ما شعبدہ بازی می کرد۔
ھمۂ این آدمھا تا آب شدن برفھادر خانۂ ما می ماندند۔من عاشق اتاقھایِ پُر جمعیت بودم ولحافھای گستردہ کنارھم روی قالی ومیزھای انباشتہ از انواع خوراکی ھا: تنگھایی شربت، کاسہ ھای پر از دانہ ھای انار، ظرفھایِ شُلہ زرد و پستہ وسوھان وگزِا صفہان و باقلوای لذیذی کہ مادر درست می کرد۔"۵۸

(ان دنوں کیسا لطف آتا تھا جب کبھی ہمارے ہاں مہمان آجاتے ۔ برف باری سے تمام راستے مسدود ہوجاتے تھے اور جو کوئی مہمان بھی ہمارے گھر میں آتے وہ مزید دو تین راتیں ٹھہر جاتے___ ہمارے ہاں آنے والے مستقل نوعیت کے مہمان یہ تھے:
___ دبلی پتلی اور بے حد شفیق نانی جان جو دن رات نمازیں پڑھتی رہتیں اور خدا سے ہمارے خوش قسمتی، خوش حالی، صحت وسلامتی اور طویل العمری کی دعائیں مانگتی رہتیں۔
___ بی بی جان، جو میری امی کی ایک معمر خالی تھیں، جنھیں صاف سنائی بھی نہ دیتا تھا۔ ان کی یادداشت خراب ہوچکی تھی جس کے باعث وہ مجھے بھائی کی جگہ، بھائی کو ماموں کے بیٹے کی جگہ اور ماموں کے بیٹے کو ہمسایے کی جگہ اور ہمسایے کو میری جگہ قیاس کرلیتی تھیں۔
___ میری خوب صورت سی خالہ آذر، جو اپنے چھوٹے چھوٹے شرارتی بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آیا کرتیں اور یہ بچے مل جل کر ہر وقت گھر کے برامدوں میں چاروں طرف کھیلتے کودتے رہتے، دیواروں اور درختوں کو پھلانگتے رہتے، اپنے منھ سے عجیب وغریب آوازیں نکالتے ہوئے جنگلی بندروں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے سے پھسلتے ہوئے اوپر نیچے آتے جاتے رہتے۔
___ ماموں جان، احمد خان جو کہ دنیا کے مہربان ترین دندان ساز تھے، اس قدر کہ ان کا جی ہی نہ چاہتا تھا کہ وہ کسی کا دانت نکالیں ۔ جب کبھی ہم میں سے کوئی رویا کرتا، تو ان کی آنکھیں بھی بھیگ جاتیں۔
___ بڑے ماموں، جو کہ کبھی توپ خانے میں افسر تھے مگر گھوڑے سے بدکتے تھے اور توپ اور بندوق سے ہراساں رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ملازمت کے آغاز ہی میں اپنے افسرانہ لباس سے نجات حاصل کرلی تھی

اور اس کے بجائے ایک 'خاتون خانہ' کا روپ دھار لیا تھا، یعنی یہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتے تھے اور مزے دار مربے تیار کرتے اور رنگارنگ اونی بلاؤز بُنا کرتے تھے۔

___ اور سب سے آخر میں موٹی تازی اور نہایت سست الوجود، تو باخانم جنھیں عجیب وغریب قسم کی کہانیاں آتی تھیں اور جنوں اور روحوں سے بھی ان کے خاصے روابط تھے۔ یہ تعویذ گنڈے کے فن میں طاق تھیں اور ہمیں مختلف ٹونے ٹوٹکے بھی کر کے دکھایا کرتی تھیں۔

اور یہ سبھی لوگ برف کے پگھلنے تک ہمارے ساتھ گھر میں مقیم رہتے۔ میں لوگوں سے بھرے پُرے کمروں پر فدا تھی اور قالین پر بچھائے گئے لحافوں اور کھانوں سے بھری ایسی میزوں پر بڑی فریفتہ تھی: جہاں شربت سے بھرے جگ، انار کے دانوں سے بھرے، پیالے شلہ زرد کی پلیٹیں، پستے، سوہان، گز اصفہان اور امی جان کی تیارشدہ مزے دار باقلوا کو بڑے قرینے سے چُنا گیا ہو۔)

یوں گلی ترقی نے ایران سے وابستہ یادیں بڑے پُر تاثیر اسلوب میں رقم کی ہیں۔ ہر سطر پر احساس ہوتا ہے کہ وقت ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور زمانے کی ہر لہر میں انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی داستانیں رقم ہیں۔ یاد نگاری کے عنصر کی پیش کش کرتے ہوئے گلی ترقی کا قلم اکثر وبیش تر معجز آفریں صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ایران کے لوگوں، یہاں کی بود و باش، کھانے پینے کی اشیا، آداب طعام، رسوم و روایات، ملبوسات، گھروں کے نقشوں، گلی محلے کی صورتوں اور جغرافیائی خدوخال کو کمال مہارت سے بیان کرتی ہیں۔ اس عمل کے دوران انسانی نفسیات پر ان کی گرفت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ علمِ نفسیات کی باریکیوں سے آگاہ تھیں اور اس علم کی نمود ان کے افسانوی ادب میں عجیب وغریب احساس پیدا کر گئی ہے۔ ان کے ہاں یادنگاری کی پیش کش میں نفسیاتی ژرف بینی کا عنصر بڑی روانی سے دخیل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیتے لمحوں سے وابستہ گلی ترقی کے یہ قصّے بڑے اثر انگیز اور وجد آفریں ہیں۔ ان کے افسانے ''دوستِ کوچک'' سے یادنگاری پر مبنی اسی پہلے زاویے کی جھلکیاں دیکھیے جہاں بچپن کی دوستی کو نفسیاتی رنگ میں دکھایا گیا ہے:

> ''سوِ تلانا! هنوزهم از گفتن اسمش واهمه دارم و یادش مضطربم می کند۔ می خواهم فراموشش کنم اما خاطره ها هجوم می آورند۔ قلبم می زند، دریای جنوب و بچه ها از یادم می روند۔ صدها تصویر پراکنده از سوِ تلانا، مثل گرد بادی آشفته، توی سرم می چرخند و حفاظهای نازک ذهنم را درهم می شکنند۔ انگار که همین دیروز بود۔ همین صبح پیشین......
>
> دوازده سال دارم و خوشبخت ترین بچهٔ روی زمینم۔ دوست کوچک همبازی من است و دوستی ما ابدی است۔ صدای شیرین و کودکانهٔ او در گوشم می پیچد: از این به بعد من و تو یک نفرهستیم۔ هر بلایی سرتو بیاید سرمن هم خواهد آمد۔ هر وقت یکی از مابمیرد آن یکی هم خواهد مرد۔ دوست دوست تا روز قیامت''[9]

(سویتلا نہ ___ آج بھی اس کا نام پکارتے ہوئے میں پریشان ہو جاتی ہوں اور اُس سے متعلق یادیں مجھے

بے حد بے چین کر دیتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اُسے بھلا دوں لیکن اُس کی یادیں چاروں طرف سے یلغار کر دیتی ہیں۔ایسے میں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔جنوب کی طرف بہتا دریا اور وہاں موجود میرے بچے جیسے میرے ذہن ہی سے رخصت ہوجاتے ہیں۔سویتلانہ سے متعلق سیکڑوں منتشر تصویریں، کسی بگولے کی طرح میرے ذہن میں گھومنے لگتی ہیں اور پھر میرے ذہن کی نازک حدود کو توڑ دیتی ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ابھی یہ کل کی بات ہو،ابھی گذشتہ صبح کی ـــــ

میں بارہ برس کی تھی اور اس روئے ارضی پر خود کو ایک خوش قسمت ترین بچی سمجھتی تھی کیونکہ میری ہم جولی میری ننھی دوست تھی ار ہماری دوستی لافانی تھی۔ اس کی میٹھی اور بھولی بھالی آواز میرے کانوں سے آج بھی ٹکراتی ہے'' آج سے میں اور تم ایک ہیں، اگر تم پر کوئی مصیبت آئی تو مجھ پر بھی آئے گی۔کبھی اگر ہم میں سے کوئی ایک مرگیا تو دوسرا بھی دم توڑ دے گا۔ہم دونوں دوست ہیں، قیامت کے دن تک دوست ـــ)

''سِو تلانا، بعداز سالھای سال، دوبارہ ظاہر شدہ است،مثل کبوترِ قاصدی گم شدہ رسیدہ از راہ ، خستہ و بال وپر ریختہ و ناتوان۔نگاھش می کنم و می بینم کہ طلسم تو باخانم ، عاقبت، کار خودش را کردہ است ودلم می گیرد۔چشمھای آبی و درشتش خالی از خاطرہ ھای دور است و درھجوم وتجاوز ھزاران تجربۂ تلخ وشیرین و درگذر سرسام آور روز ھاو حادثہ ھا، مدرسہ فیروز کوھی و دوست کو چک را از یاد بردہ است۔

پسرم از دورصدائم می زند۔ با بچہ ھای دیگر، لبِ آب، سرگرم بازی است۔نفس می کشم۔ باری سنگین از روی قلبم می افتد۔ بار حسادتی کھنہ، تلخ و مُخرّ ب۔کاش بازیھای سہ نفری را پذیرفتہ بودم ، می نشینم کنار بچہ ھا۔کسی تو ی من می لولد ۔کسی زیر پوستم می خزد وصدایی تہ گوشھایم می گوید:'' دوست ، دوست، تا روز قیامت۔''[۱۰]

(سویتلانا ـــ کئی برسوں کے بعداب دوبارہ دکھائی دی تھی۔کسی گم شدہ پیغام رساں کبوتر کی طرح جو راستے میں ہو اور مارے تھکن کے مزید اڑان بھرنے سے قاصر ہو۔ وہ کافی بکھری ہوئی اور کم زور دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو مجھے محسوس ہوا کہ تو باخانم کے ٹونے ٹوٹکوں نے بالآخر کام کر دکھایا ہے اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا۔ اس کی نیلی آنکھیں حلقۂ چشم میں یادوں سے عاری دکھائی دے رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ اس نے زندگی کے ہزاروں تلخ وشریں تجربات کی یلغار میں اور نت نئے واقعات اور چکا چوند کر دینے والے بے شمار دنوں کی گزران کے بعد 'مدرسہ فیروز کو ہی' کو اور اپنی ننھی دوست کو بھلا دیا ہے۔میرا بیٹا مجھے دور سے آواز دے رہا ہے۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ پانی کے کنارے کھیلنے میں منہمک ہے۔ میں ایک لمبی سانس لیتی ہوں ۔اب میرے دل سے ایک بھاری بوجھ اتر چکا ہے۔ایک پرانی جلن کا بوجھ، نہایت کڑوا اکسیلا اور برباد کر دینے والا بوجھ۔ کاش کہ میں نے تین افراد کا کھیل قبول کرلیا ہوتا ! میں بچوں کے نزدیک ہی بیٹھ جاتی ہوں ۔یوں لگتا ہے جیسے کوئی

احساس اب بھی میرے وجود کے اندر کروٹیں لے رہا ہے، کوئی جیسے میری جلد کے اس حصے پر کاٹ رہا ہو (جہاں ہم نے بلیڈ سے دوستی کا نشان ثبت کیا تھا) اور کوئی آواز میرے کانوں میں کہہ رہی ہے:

''ہم دونوں دوست ہیں، قیامت کے دن تک دوست۔'')

'' بعضی عصر ها، بعد از تعطیل شدن مدرسه، پشت بشکه های آب، قایم می شویم، صبر می کنیم تا همهٔ بچه ها بروند۔ هیچ شاگردی حق ندارد تنها در مدرسه بماند و ما می مانیم۔ سرپیچی از دستور مدیر ومعلم باعثِ افتخارِ ماست (البته دوست کوچک می گوید و من به حرف اوگوش می دهم) تنها ماندن توی کلاس های خالی کیفِ عجیبی دارد؛ انگار وارد جایی ترسناک و ناشناخته شده ایم، وارد یک جور خواب شیرین، با تبی کیف آور، پراز رنگهای تند وشکلهای مجهول واتفاقهای ناگهانی۔ مدرسه، بعد از تمام شدن کلاسها جایی دیگر می شود؛ راهروها به نظر درازتر می آیند و راه پله ها پیچ پیچی تر، پراز سایه های عجیب وغریب و پیچ پیچ های دلهره انگیز۔ سکوت اتاقها آدم را به فکر کارهای بدمی انداز د ورنگ میز وصندلیها عوض می شود۔ درختهایی حیاط قد می کشند و بوی خاصی از گنجه های تاریک بیرون می زند۔ توی کلاسهای خالی می چرخیم وهرکار که دلمان خواست می کنیم۔ من ته دلم، از این آزادی می ترسم و به نظرم می رسد که چشمی نامرئی مراقب کارهایم است وجلوی فکرها وخواسته هایم را می گیرم۔ دوست کوچک است که مرا به دنبالِ خودش می کشد۔ اوست که باعث می شود همهٔ نصیحتهایی مادروترس ازتهدید وتنبیه پدرازیاد برود۔''[۱۱]

(کبھی کبھی شام کو اسکول سے چھٹی کے بعد ہم پانی کے پیپوں میں چھپ جاتیں اور سب بچوں کے گھر چلے جانے کا انتظار کرتیں۔ کسی بھی بچے کو اسکول میں اکیلے رکنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن ہم وہیں ٹھہر جایا کرتی تھیں۔ ہیڈ ماسٹریس صاحبہ اور استانی صاحبہ کے حکم سے نافرمانی کرنا ہمارے لیے باعثِ فخر ہوتا (اصل میں یہ سب ننھی دوست کہا کرتی تھی اور میں تو بس اس کی باتوں پر ہی کان دھرتی تھی)۔ کلاس کے خالی کمروں کے اندر اکیلے رکنا ایک عجیب وغریب طرح کا لطف رکھتا تھا؛ یوں لگتا کہ ہم ایک بھیانک اور نامعلوم سی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں؛ بالکل یوں جیسے کسی میٹھے سے سپنے میں شامل ہو چکے ہیں یا کسی ایسی پُر لطف جگہ پر آ گئے ہیں، جو شوخ وشنگ اور چبھتے ہوئے رنگوں اور نامعلوم ہیولوں اور ناگہانی واقعات سے بھرپور ہے۔ چھٹی کے بعد اسکول ایک بالکل نئی جگہ میں تبدیل جاتا؛ کوریڈورز لمبے لگتے اور سیڑھیوں کے راستے پیچ در پیچ اور عجیب وغریب سایوں اور دل کو دہلا دینے والی چپڑ چپڑ باتوں سے بھرپور دکھائی دیتے۔ یوں لگتا جیسے کمروں کی خاموشی انسان کو برے کاموں کو انجام دینے کی سوچوں میں الجھا رہی ہو اور میزوں اور کرسیوں کے رنگ بدلے ہوئے معلوم ہوتے۔ صحن میں واقع درخت اپنے قد مزید کھینچ لیتے اور الماریوں کی تاریکیوں میں سے ایک مخصوص سی خوش بو آتی۔ ہم خالی کلاسوں میں گھومتیں اور ہمارا جو بھی دل چاہتا، کر گزرتیں۔ میں دل ہی دل میں ایسی آزادی سے خوف بھی کھاتی تھی اور مجھے ہر وقت یہی لگتا جیسے کوئی غیر مرئی آنکھ ہماری ان سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہوئے ہے اور جو ہماری ان سوچوں اور خواہشوں کے آگے بڑا ایک بند باندھنا چاہتی ہے۔ لیکن ننھی دوست مجھے اپنے پیچھے پیچھے لیے جاتی۔ ایک وہی تھی جو امی جان کی تمام تر

نصیحتوں اور ابّا جان کے خوف اور ڈانٹ ڈپٹ کو میرے ذہن سے محو کر دیا کرتی۔)

اسی طرح گلی ترقی نے اپنے افسانے ''خانہ مادر بزرگ'' میں بچپن کی یادوں کو وقت کے سرعت سے گزر جانے اور زندگی کے قیمتی لمحوں کے بیت جانے کے عمل کو فلسفیانہ تناظر میں یوں دکھایا ہے:

''خانہ مادر بزرگ را فروختہ اند وساعت بزرگ دیواری در منزل یکی از دایی ھاست ـــ آخرین دایی۔ گہ گاہ، در نیمہ شبی بی خواب، تیک و تاک موذی آن رادر تہ بالشم می شنوم و می دانم کہ ''این ساعت بعد از ماھم خواھد بود'' واز سماجت عقربہ ھای چرخان آن دلم می گیرد و بعد، نزدیک بہ روشنایی صبح، عطری گوار، مثل نفسی سبک و متبرک در اتاق می پیچد و نوازشِ دستِ ہمیشہ مھربان گوھر تاج خانم را روی پیشانیم حس می کنم و دلم با زپُر از ولولہ ھای کودکی می شود۔ می دانم کہ در نوازش این دستِ آشنا حرفی قدیمی خفتہ است؛ حرفی سادہ و سالم و سبکبار، مثل آواز بازیگوش پری ھا فراسوی تیک تاکِ دلھرہ انگیزِ ساعتھای جھان۔''[۱۲]

(نانی جان کے گھر کو بیچ دیا گیا اور دیواری گھڑی اب ایک ماموں کے مکان میں ہے ـــ سب سے چھوٹے ماموں کے گھر میں ـــ کبھی کبھار میں آدھی رات کو بے خوابی کی حالت میں اپنے تکیے کے نیچے سے اس کی دل کو دہلا دینے والی 'ٹک ٹک' کی صدا سنتی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ ''یہ گھڑی ہمارے بعد بھی ہوگی'' اور اس کی گھومتی ہوئی سوئیوں کی مسلسل اور مستقل حرکت کے متعلق سوچ کر ہی میرا جی بھر آتا ہے اور پھر دفعتاً صبح کے اجالے کے ساتھ ہی ایک نہایت خوش گوار مہک، ایک ہلکی اور پاکیزہ سانس کی طرح میرے کمرے کو معطر کر دیتی ہے ـــ میں اپنی پیشانی پر گوہر تاج خانم کے ہمیشہ سے مہربان ہاتھ کی نرماہٹ محسوس کرتی ہوں اور میرا دل بچپن کے ہنگاموں سے لبریز ہو جاتا ہے ـــ میں جانتی ہوں کہ اس مانوس ہاتھ کے یوں مجھے تھپتھپانے میں ایک پرانی رمز چھپی ہوئی ہے؛ ایک سادہ، محفوظ اور بےفکری رمز ـــ جو اس جانب پر یوں کی شوخ اور شریر صداؤں کی طرح ہے جب کہ دوسری طرف دنیا بھر کی گھڑیوں کی دل کو دہلا دینے والی 'ٹک ٹک' کی آواز ہے!!)

افسانہ ''پدر'' یادنگاری کے سلسلے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک عمدہ افسانہ ہے۔ یہاں اکثر مقامات پر گلی ترقی کی شدتِ جذبات کا موثر اظہار ملتا ہے۔ گلی ترقی نے اپنے والد سے وابستہ تمام تر یادوں کا بہ خوبی احاطہ کیا ہے۔ خاص طور پر اپنے والد کو اپنی ذات اور پورے خاندان کے لیے ایک سائبان کے طور پر متعارف کرواتے ہوئے ان کا قلم تحیّر خیز ہو جاتا ہے، لکھتی ہیں:

''خانۂ شمیران محورِ زندگی یک قبیلہ است وما بچہ ھای قد و نیم قد، خوشحال و بی خبر، پا بہ پای تبریز ھای جوان قد می کشیم و دوام چمن ھای سبز و پرباریِ درختانِ میوہ را ابدی می دانیم۔ ھیچ کس در خانۂ شمیران بہ رفتن و مُردن آدم ھا فکر نمی کند و من و مادر و حسن آقا و دیگران، نشستہ زیر چترِ ساحرِ بزرگ، خود را مصون از گزند زمان و زخم سرنوشت می پنداریم و پدر می گوید: ''من فولادم و فولاد ھرگز زنگ نمی زند''

دروغ همم نمی گوید۔ هیچ کس تا به حال نا خوشی او را ندیده است۔ اراده اش از آهن است و اعصابش از سنگ۔ به سه چیز اعتقاد دارد: عدالت، علم، تجدد و البته ثروت۔ وثروت برای رسیدن به قدرت و قدرت برای رهایی از ضعف وخفت و احتیاج، برای رهایی از حسرت وتملک و نیاز۔''[۱۳]

(شمیران کا گھر ایک خاندان کی زندگی کا محور و مرکز تھا۔ ہم سب، ہر عمر کے بچے، بڑی بے خبری اور بڑی بے پروائی کے ساتھ خوش وخرم اس گھر کے تبریزی کے درختوں کے سایے میں پروان چڑھ رہے تھے۔ ہم اس گھر کے سرسبز وشاداب باغیچوں اور پھلوں سے لدے درختوں کو ایک زندہ جاوید حقیقت سمجھتے تھے۔ شمیران کے گھر میں کسی کو بھی کسی دوسرے جگہ چلے جانے یا یہاں سے رخصت ہونے کا خیال تک نہ آتا تھا__ میں، امی جان اور حسن آقا اور گھر کے سبھی افراد ہر وقت ایک عظیم ساحر کے سائبان تلے خود کو زمانے بھر کے حادثوں اور تقدیر کے زخموں سے محفوظ خیال کرتے تھے اور ابا جان بھی یہی کیا کرتے تھے کہ: ''میں فولاد ہوں اور فولاد کو کبھی زنگ نہیں لگتا۔'')

افسانے کے آخر میں والد کی شفقت بھری شخصیت کے علیل ہوجانے پر گلی ترقی زندگی کے تمام تر منظر نامے کو یوں بدلتا ہوا دکھاتی ہیں:

''روز تخریب می رسد۔ شاید خواب می بینم؟ شاید باغ سبز شمیران خوابی شیرین بود و بیدار شده ایم ! آن چه که فکر می کردیم از فولاد است و پایه هایش همیشگی است، باتلنگری فرومی ریزد، غباری غلیظ، مثل نفسی هیولایی، باغچه های رنگین وچمن های شفاف را فرومی بلعد وخانۂ شمیران، باهمه دَنگ وفنگ وحارت و پورت وجلال و زیباییش، مثل تصویری خیالی، آرام آرام، ناپدید می شود و پری دریایی، باحباب بلورینش روی سر، ریز ریز انبوهی از آجر وسنگ وخاک، از یادها می رود۔ آشپزخانۂ حسن آقا هم چون حبابی نازک، به هزاران ذرۂ چرخان درهوا تبدیل می شود وهمراه آن بوهای شیرین کودکی، مزه های لذیذ قدیمی و موهبت های سادۂ گذشته، مثل خطوطی فرّار درفضا، از پهنۂ زندگی ما__ زندگی من__ دورمی شوند۔

پدر، نیمه جان و بی رمق، امّا زنده و دوباره غالب برآخرین حملۂ حریف، باز می گردد و به جای خالی خانۂ شمیران بدون حسرت و یا اعتراض، می نگرد۔ سکوت می کند وسکوتش، به چشم من، درد ناک تر از داد وقال و پیکار چندین ساله اش است۔''[۱۴]

(بالآخر بربادی کا دن آن پہنچا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں ! شاید شمیران کا سرسبز وشاداب باغ محض ایک خوب صورت سپنا تھا جس سے اب ہم بیدار ہو چکے تھے۔ وہ شخص جس کے متعلق ہم سوچتے تھے کہ فولاد کا بنا ہوا ہے اور اس کے وجود میں ہیشگی ہے، تقدیر کے چابک کی ایک ہلکی سے چوٹ سے ڈھیر ہو چکا تھا۔ اب ایک کثیف دھول نے ہوا کے کسی عفریتی جھونکے کی طرح، اس گھر کے سرسبز شاداب باغیچوں اور گھاس کے صاف ستھرے میدانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ شمیران کا گھر اپنی تمام تر شان وشوکت، شورشرابے

اور جلال و جمال کے ساتھ کسی خیالی منظر نامے میں تبدیل ہو کر دھیرے دھیرے کہیں دُور گم ہو گیا تھا۔ گھر کے حوض کی جل پری اپنی سر کے اُوپر نصب شیشے کے بلبلے کے ہمراہ اینٹ، پتھر اور مٹی کے ایک بڑے ڈھیر کے نیچے دب چکی تھی۔ یوں ہماری یادوں سے یہ گھر رخصت ہو گیا۔ حسن آقا کا باورچی خانہ بھی کسی نازک بلبلے کی طرح فضا میں گردش کرتے ہوئے ہزاروں ذرّوں کا حصہ بن گیا اور اس کے ساتھ ہی بچپن کی میٹھی یادیں، پرانی لذتوں کے مزے اور بیتی ہوئی خالص نعمتیں بکھری ہوئی لکیروں کی طرح فضا میں گم ہو کر رہ گئیں___ یہ سب کچھ ہماری زندگی کی وسعتوں سے کہیں دور اور میری زندگی سے نکل کر کہیں کھو کر رہ گیا۔

ابا جان نیم مردہ تھے۔ ان کی سانس اکھڑی ہوئی تھی مگر زندہ تھے اور ایک مرتبہ پھر اپنے مدمقابل بیماری کے آخری حملے پر غالب آ چکے تھے۔ وہ واپس آ گئے اور شمیران کے گھر کی ویران جگہوں کو بغیر کسی حسرت یا کسی ردِّعمل کے محض تکتے رہے۔ وہ خاموش تھے اور میرے لیے ان کی یہ خاموشی ان کی انصاف اور سچائی کے لیے برسوں کی جانے والی دوڑ دھوپ اور جدوجہد سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھی۔)

گلی ترقی کے افسانوں میں یاد نگاری کے ضمن میں دوسرا زاویہ یہ وہ ہے جہاں وہ ایران میں انقلاب برپا ہونے کے بعد کی یادوں کو رقم کرتی ہیں۔ پیرس جانے سے قبل کی یہ یادیں انتہائی حزن آمیز پیرایے میں مرقوم ہیں۔ افسانہ ''خدمتگار'' سے مثال دیکھیے:

> ''ماندہ بودیم دست تنھار، در خانہ ای سرد و بی سروصدا۔ شبھا کہ برق می رفت پای چراغ نفتی کز می کردیم و اگر دستی بہ درمی خورد از ترس نفسمان می برید۔ جوانتر ھای فامیل خیال سفر داشتند و عازم فرنگ بودند۔ نگرانی برای پیرھا بود؛ نہ می شد بردشان و نہ می شد تنھاپشان گذاشت۔ مادر بزرگھا نیمہ جان و زمینگیر بودند و خیال مردن نداشتند۔ پدر مادر ھای جوانتر از تغییر زندگی و جابجایی، در آن سن و سال، وحشت داشتند و از ماندن و تنھایی وجنگ و انقلاب می ترسیدند۔ عموجان سرھنگ فراری بود۔ شوکت اعظم خانم از فکر قحطی و غارت خواب نداشت۔ عمہ ملک از عملہ ھای افغانی می ترسید و مطمئن بود کہ یکی از آن شبھا سرش را خواھند برید۔ دستِ لرزانش را با اندوہ بہ غبغب شیرینش می کشید و تیزی چاقو را توی گوشت فربہ اش حس می کرد و آھش درمی آمد۔ دایی جان دکتر از ھمہ عاقل تر بود و زود بہ فکر چارہ افتاد۔ اول از ھمہ دو تاسگِ گرگی خرید، کہ بلا فاصلہ ران مادر و مچ پای استخوانی زنش را گاز گرفتند، و چندین جور وسیلۂ خبر وسوتِ خطر بہ در و دیوار خانہ نصب کرد۔ در اتاقھا چراغ چشمک زن کار گذاشت ونگھبانی گرفت تا مراقب خودش وخانہ اش باشد''۔[۱۵]

(یوں انقلاب کے دنوں میں ہم اپنے خاموش اور شورشرابے سے عاری گھر میں بالکل تنہا ہو چکے تھے۔ راتوں کو جب بجلی چلی جاتی تو ہم تیل کی لالٹین جلا لیتے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا تو ڈر کے مارے ہماری سانسیں رک جاتیں۔ خاندان کے سبھی نوجوان افراد ہجرت کا ارادہ کر چکے تھے بلکہ ان میں سے اکثر یورپ

سدھار بھی چکے تھے۔ پریشانی تو صرف بوڑھوں کے حوالے سے تھی کہ انھیں ساتھ نہ لے جاسکتے تھے اور نہ ہی یہاں وطن میں تنہا چھوڑ سکتے تھے۔خاندان کی دادیاں نانیاں سبھی نیم مردہ اور مفلوج تھیں اور فی الحال مرنے کا ارادہ بھی نہ رکھتی تھیں۔ جوان ماں باپ زندگی میں رونما ہونے والی اس اچانک تبدیلی سے اور یوں اپنے گھروں سے بے گھر ہوجانے پر، اس سن وسال ہی میں عجیب وغریب خوف، خدشات اور وحشت کا شکار ہوچکے تھے۔ وہ خاصے تھکے ہارے اور شکستہ محسوس ہوتے تھے اور ہر وقت کے اکیلے پن، جنگ اور انقلاب کے ہنگاموں سے سخت ہراساں تھے۔ ہمارے چچا جان جو کرنل تھے اب مفرور ہوچکے تھے۔شوکت اعظم خانم کو پریشانی، قحط کے خوف، لوٹ مار، پکڑ دھکڑ اور عام بربادی کے واقعات کے باعث ساری رات نیند نہ آتی۔ پھوپی جان ملک، افغانی مزدوروں(۲) سے سخت خوف زدہ تھیں اور انھیں لگتا تھا کہ یونہی کسی رات کوئی افغانی آ کر ان کا سر اڑا لے جائے گا۔ وہ خیال ہی خیال میں وحشت کے مارے کپکپاتے ہاتھوں کو اپنی موٹی گردن پر رکھ کر خود کو بے دم سا محسوس کرتیں، چشمِ تخیل سے اپنے کیم شحیم جسم پر چاقو کی تیز دھار اترتی ہوئی دیکھتیں اور یہ سب کچھ سوچ کر اُن کی چیخیں نکل جاتی۔ ہمارے ڈاکٹر ماموں جان سب سے زیادہ عقل مند نکلے اور انھوں نے قدرے سرعت سے اس خوف اور مصیبت کا حل ڈھونڈ لیا۔ اول یہ کہ انھوں نے دو بھیڑیا نما کتے خرید لیے (جنھوں نے آتے ہی پہلے امی جان کی ٹانگ پر اور پھر ان کی بیوی کے ٹخنے کی ہڈی پر کاٹ ڈالا) دوسرا یہ کہ مختلف نوعیّتوں کے اطلاعاتی ذرائع اور خطرے کی گھنٹیاں اپنے دروازے پر اور دیواروں میں جابجا نصب کردیں۔مزید براں کہ کمروں میں ٹمٹماتے ہوئے بلب لگا دیئے اور دروازے پر ایک محافظ بھی مقرر کیا تا کہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی حفاظت بہتر طور پر کرسکیں۔)

گلی ترقی کے افسانوں میں یاد نگاری کے عنصر پر مبنی تیسرا زاویہ وہ ہے جہاں وہ ہجرت کے بعد پیرس میں قیام کے دوران رونما ہونے والے مختلف حوادث و واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے ناسٹیلجیا کا شکار نظر آتی ہیں۔تمام تر اداسیوں، محرومیوں اور مایوسیوں کے باوجود یہاں زیادہ تر مثبت ماضی پسندی کا رنگ ابھرا ہے۔ اس دور کے افسانوں میں بہت سے مقام ایسے آتے ہیں کہ بعید وقریب کی یادیں ایک دوسرے کو قطع کرنے لگتی ہیں اور یوں یاد نگاری کا پہلو دل چسپ صورت اختیار کرلیتا ہے۔افسانہ ''مادام گرگہ'' سے اقتباس دیکھیے جہاں بے وطنی کے المیے کو نفسیاتی رنگ وآہنگ میں بیان کیا گیا ہے:

> ''ھمۂ ما، من و بچہ ھام و دوستانی کہ گہ گاہ بہ سراغم می آیند، مثل سگ از ھمسایۂ طبقۂ زیرین می ترسیم۔ زندگی در غربت، در پاریس، ھمراہ باد لھرہ ھای پنھانی است و احساس گناہ از این کہ غریبہ ای از آن سوی مرزھا آمدہ و جای خودی ھارا غصب کردہ است و نوعی پوزش وعقب نشینی اجباری و خشمی خاموش کہ جرأت بروز ندارد و احساسِ تحقیری درونی کہ نیش می زند و منتظر تلافی است وغروری کہ دوھزار و پانصد سال ریشہ دارد و نگاھی کہ پیوستہ از آن بالا، باتردید و تمسخر، بہ عوارضِ تمدن وتجدّد می نگرد و اعتماد بہ این کہ ما، نوادگان کورش و داریوش، حتیٰ در شکست و فلاکت و زوال نیز از ھمہ برتریم چرا؟ خدا می داند۔ و اگر بہ این روز افتادہ ایم و از آن ھمہ دبدبہ و

پچھچھ و دَنگ و فنگمان چیزی باقی نمانده تقصیر شما؛ شما غربی ھای استثمار گرِ پول پرستِ ظاھربین۔''[۱۶]

(میں، میرے بچے اور ہمارے ملنے والے جو کبھی کبھار راستہ بھول کر ہم سے ملنے آ ہی جاتے تھے، سبھی نچلی منزل میں مقیم ہماری پڑوسن سے یوں ڈرتے تھے، جیسے کوئی سگِ آوارہ سے ڈرتا ہے۔ پیرس میں بسر ہونے والی ہماری مسافرت کی یہ زندگی بے شمار چھپے ہوئے صدموں اور ایک عجیب وغریب سے احساس گناہ سے عبارت تھی کہ ہم سرحد پار سے یہاں آجانے والے مطلق اجنبی ہیں۔ ہمارے گھر بار غصب کیے جا چکے تھے اور یہ سوچ کر ہمارے وجود پر ہر وقت ایک طرح کی معذرت، پسپائی اور ناراضی مسلط رہتی، جو بظاہر دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔ یہ اندر ہی اندر جنم لینے والا ایک ایسا احساس کم تری تھا، جو ہمہ وقت وجود کے اندر ڈنک سا مارتا رہتا اور ہر وقت کسی مداوے کا منتظر رہتا۔ یا پھر اس کیفیت کو ایک ایسے جذبہ غرور کا نام دیا جاسکتا ہے جو دو ہزار پانچ سو برس پر محیط تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ماضی کے جھروکوں سے کوئی نگاہ ٹکٹکی باندھے ہماری جانب متوجہ ہے اور تذبذب اور تمسخر کے ساتھ ہمارے شب وروز میں رونما ہونے والے تمام تہذیبی و روایتی اور جدت پسندانہ واقعات وحادثات کی نگرانی کرتی رہتی ہے۔ یہ سوچ کر ہمیں ایک اعتماد اور وقار بھی محسوس ہوتا کہ ہم کورش و داریوش کی اولاد میں سے ہیں اور آج بھی تمام تر شکستوں اور ناکامیوں، بے چارگیوں اور زوال آشنائیوں کے باوجود اعلیٰ اور برتر ہیں___ اور یہ سب کچھ کیونکر رونما ہوا تھا؟ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم تو یہی سوچتے تھے کہ آج اگر ہم بربادی و بدحالی سے دوچار ہیں تو اس میں محض آپ فرنگیوں کا قصور ہے، آپ جو ظاہردار اور دولت کے پجاری اہل مغرب ہیں، آپ ہی جو سرتا سر ہماری بے وطنیوں کے ذمے دار ہیں اور آپ ہی ہیں جو ہمارے تمام تر استحصال کررہے ہیں۔)

یہاں گلی ترقی کے عالمِ شیب میں مرقوم بعض ایسے افسانوں کا تذکرہ ضروری ہے جو ان کی شخصیت میں نفسیاتی اعتبار سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بھرپور عکاس ہیں۔ اس سلسلے میں دو افسانے ''اوّلین روز'' اور ''آخرین روز'' بنیادی طور پر تو پیرس کی فضاؤں ہی کا احاطہ کرتے ہیں لیکن مصنفہ کے اُس دور کے ترجمان ہیں جب اس کے بچے بڑے ہو چکے ہیں، زندگی آگے بڑھ گئی ہے اور اسے اپنے بعض نفسیاتی مسائل کی گرہ کشائی کے لیے نفسیاتی کلینک جانا پڑتا ہے۔ اس کلینک میں داخل ہونے اور بالآخر صحت یاب ہوکر گھر لوٹنے کا منظر دونوں افسانوں میں یادنگاری کے جلو میں عمدگی سے پیش ہوا ہے۔ افسانہ ''اوّلین روز'' سے اقتباس دیکھیے:

''من اینجا چه کار می کنم؟

آدم ھای مچاله، با صورت ھای مقوایی وچشم ھای مسدود، روی نیمکت ھای چوبی کنارهم نشسته اند۔ آدم ھای ویران با دست ھای پیر۔

از این پرستار ھای سفید پوشِ موطلایی وحشت دارم۔ از این باغ خاموش بیگانه۔ از این درخت ھای سوگوار با سایه ھای غمگین خاکستری، از این شمشاد ھای صاف منظّم، یک اندازه، یک شکل، ایستاده کنارهم، مثل سربازی ھای آماده بخدمت۔

به باغ شمیران فکر می کنم، به درختان تبریزی که همبازی های من بودند، به مجسمه های گچی توی باغچه هاو پری دریایی چاق و چله ای که پای استخر ایستاده بود۔ پدرم را می بینم که روی صندلی راحتی اش، زیر درختان چنار، کنار جوی آب نشسته و سایه بزرگش تا انتهای باغ شمیران گسترده است۔

می گوید: ''من خانه ای بزرگ با باغ و استخر ومجسمه های سنگی دور وبر باغچه هایش می خواهم، خانه ای با اتاق های آفتا بگیر و زیرزمین های خنک برای روز های داغ وایوانی وسیع برای خوابیدن زیر صاف ترین آسمان جهان۔'' [۱۷]

(میں یہاں کیا کررہی ہوں؟ ان عجیب وغریب اور بے ڈھب جسموں اور ساکت آنکھوں والے لوگوں کے درمیان آخر میں کیا کررہی ہوں؟ یہ جو میرے ساتھ لکڑی کے بینچوں پر بیٹھے ہیں، میں ان کمزور ہاتھوں والے اُجڑے اور برباد لوگوں کے درمیان کیونکر ہوں؟___ مجھے سفید یونیفارم میں ملبوس اُن سنہری بالوں والی نرسوں سے وحشت محسوس ہورہی ہے۔ مجھے سخت الجھن ہورہی ہے اس ویران باغ سے، ان سوگوار درختوں سے جو اپنے غمگین اور خاکستری سایوں کے ہمراہ ایستادہ ہیں اور اُن شمشاد کے درختوں سے بھی جو بڑے صاف ستھرے اور منظّم انداز میں ایک ہی قد وقامت اور شکل وصورت لیے پاسبانوں کی طرح ایستادہ ہیں۔ انھیں دیکھ کر میں شمیران کے باغ کے بارے میں سوچنے لگتی ہوں، وہاں اُگے تبریزی کے درختوں کے متعلق سوچتی ہوں جو کھیل میں میرے ساتھی ہوا کرتے تھے۔ مجھے باغیچوں میں نصب چاک کے مجسمے یاد آتے ہیں اور اس دریائی پری کا مجسمہ بھی جو تالاب کے بیچ تھا۔ مجھے ابا جان بھی دکھائی دیتے ہیں جو چنار کے درختوں کے نیچے آرام کرسی پر براجمان تالاب کے کنارے بیٹھے ہیں اور مجھے ان کا دیو ہیکل سایہ شمیران کے باغ میں آخر تک پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کہہ رہے ہیں کہ: مجھے ایک بہت بڑے گھر کی تمنّا ہے جہاں باغ ہو، تالاب ہو، اس کے باغیچوں کے گرد وپیش میں پتھر کے مجسمے ہوں، یہ ایک ایسا گھر ہو جس کے کمرے روشن ہوں اور موسم گرما کے تپتے ہوئے دنوں کے لیے تہ خانے بھی ہوں اور سونے کے لیے صاف ستھرے آسمان کے نیچے ایک کشادہ صحن بھی بنایا گیا ہو)

افسانہ ''آخرین روز'' میں لکھتی ہیں :

''کتابم را محکم زیر بغل می گیرم وسنگینی دلپذیرش را، مثل بارِ سرنوشتی شیرین، به دوش می کشم۔ یک روز فقط یک روز مثل امروز، سرشار وسبکبار، پراز تب وتاب وتپش، پراز خواب وخیال، به یک عمر، به صد سال زندگی آسه بروآسه بیامی ارزد۔ شاید این وقتِ سرمستی، این فرصتِ متعالی، لحظه ای گذرا باشد، که حتماً هست۔ مهم نیست۔ خاطره اش رانگه می دارم و با یادِ این امروز، این ساعتِ شادابِ غنی، ته ماندۂ روز های آئنده را رنگین می کنم۔'' [۱۸]

(میں اپنی یادوں کی کتاب کو مضبوطی سے بغل میں دبالیتی ہوں اور ایسا کرتے ہوئے گویا اس کی دل کو لبھانے والی سختی اور گرانی کو تقدیر کے کسی قابل قبول بوجھ کی طرح اپنے کندھوں پر اُٹھا لیتی ہوں۔ ان یادوں کا بھی ہر

ایک دن لمحۂ حال ہی کی طرح سرشار، خوش حال اور سوز اور تڑپ سے بھرپور تھا، خواب وخیال سے بھرا پڑا تھا اور میری عمر بھر سے زیادہ، زندگی کی پوری صدی کے چپکے چپکے بیت جانے سے کہیں زیادہ قیمتی بھی___ شاید لمحۂ موجود کا بے خودی، بے پروائی اور سرمستی سے بھرپور یہ وقت اور اس کی بیش بہا فرصت بھی پل بھر کی سرعت میں فنا پذیر ہوجائے کہ بے شک یہی حقیقت ہے___اور یہ بات زیادہ اہم بھی نہیں ہے۔لیکن میں اس لمحے کی یادوں کو تازہ کر کے لمحۂ موجود کے اس قیمتی لمحے سے مستقبل کے بچے کھچے دنوں کو رنگین اور خوب صورت بنالوں گی۔)

بہ غور دیکھیں تو گلی ترقی نے اپنے افسانوں میں فلیش بیک کی تکنیک کو برتتے ہوئے جس طرح مثبت ماضی پسندی کا اظہار کیا گیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔گلی ترقی کے یاد نگاری پر مبنی اس افسانوی سرمایے کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنے میں تامّل نہیں ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایرانی افسانے کو جہاں دیگر فنی وتکنیکی خوبیوں سے ہم کنار کیا وہیں یادوں کے تحت الشعوری سرمایے کے اظہار سے اس میں ایسی چاشنی پیدا کردی ہے کہ قاری کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہاں پیش کردہ کردار حقیقی و واقعی دنیا کے کردار ہیں یا محض افسانوی ہیولے___ یوں گلی ترقی نے افسانوی ادب کو ثروت مند بنانے میں فعال کردار ادا کیا ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ ناہید مظفری ایرانی الاصل اسکالر ہیں۔ انھوں نے ہاورڈ یونیورسٹی سے تاریخ اور مشرقِ وسطیٰ کے مطالعات میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور نیویارک یونیورسٹی کے شعبہ ''مڈل ایسٹرن اینڈ اسلامک اسٹڈیز'' سے بہ طور ایسوسی ایٹ پروفیسر منسلک ہیں۔ ان کی متعدد کتب اور مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ جن میں "My Dear: The Pen Anthology of Contemporary writers".(2005) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ گلی ترقی سے ناہید مظفری کا ٹیلی فونک مکالمہ جو اوّلاً زبان فارسی میں اکتوبر ۲۰۱۳ء کو ہوا۔ بعدازاں انھوں نے اسے انگریزی زبان میں منتقل کیا جو انٹرنیشنل لٹریچر کے معروف آن لائن میگزین : "Words Without Borders"میں اکتوبر ۲۰۱۳ء ہی میں "Between two words: An Interview with Goli Taraghi" کے عنوان سے سامنے آیا۔تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے:

https://www.wordswithoutborders.org

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ گلی ترقی : خاطره های پراگنده، تہران : انتشارات نیلوفر، طبع چہارم ۱۳۸۲ھ۔ش، (بہ مطابق ۲۰۰۳ء) ص۳

۷۔ ایضاً،ص۳
۸۔ ایضاً،ص۳،۴
۹۔ ایضاً،ص۲۴
۱۰۔ ایضاً،ص۴۷
۱۱۔ ایضاً،ص۲۸
۱۲۔ ایضاً،ص۷۵
۱۳۔ ایضاً،ص۷۹
۱۴۔ ایضاً،ص۹۳،۹۴
۱۵۔ ایضاً،ص۹۹،۱۰۰
۱۶۔ ایضاً،ص۱۴۰
۱۷۔ گلی ترقی : دو دنیا،تہران : انتشارات نیلوفر،طبع سوم،۱۳۸۳ھ ۔(بہ مطابق۲۰۰۴ء) ش،ص ۱۱
۱۸۔ ایضاً،ص ۲۱۵

◁▷